حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمتہ اللہ علیہ

پروفیسر خالد شبیر احمد

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ جن کا مجلس احرار اسلام کے ساتھ تعلق خاطر مثالی نوعیت کا رہا جن کی دلی دعاؤں اور خصوصی توجہ سے مجلس احرار اسلام کے رضا کاروں اور اکابر میں ایک ایسا جذبۂ ایمانی پیدا ہوا جس کے سامنے قادیانیت کے مکروہ اور گمراہ کن عزائم خس وخاشاک کی مانند بہتے نظر آتے ہیں۔

مجلس احرار اسلام نے جس پامردی کے ساتھ قادیانیت کا راستہ روکا اور قادیانیت کو ہر محاذ پر شکستِ فاش سے ہمکنار کیا۔ اس میں جہاں اللہ تعالیٰ کا خاص فضل وکرم شامل حال تھا۔ وہاں دور حاضر کے اس ولی اللہ کی دعاؤں کا بھی اثر تھا۔ وہ احرار کی اس تحریک کو بنظر استحسان ہی نہیں دیکھتے تھے بلکہ اس کی رہنمائی فرماتے اور اس میں گہری دلچسپی بھی لیتے۔ وہ ہمیشہ احرار کارکنوں اور احرار رہنماؤں کو قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتے، ان کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ ان کے ساتھ محبت اور شفقت کے ساتھ پیش آتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جماعتِ احرار کا ہر فرد انہیں پیر ومرشد اور پیشوا تسلیم کرتا تھا۔ انھوں نے ہمیشہ اپنی سیاسی بصیرت کو بروئے کار لاتے ہوئے رہنمایانِ احرار کو اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ چنانچہ احرار اسلام کی اسلام دشمن تحریکوں کے خلاف تمام تر جولانیاں آپ ہی کی نگاہِ کرم کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ مجلس احرار اسلام کی تمام تر کارروائیاں جو محض دین کی سربلندی اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے تھیں، ایسی بزرگ ہستی کی دعاؤں کا صلہ ہیں۔

ابتدائی حالات:

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمتہ اللہ علیہ کے خاندان کا تعلق تحصیل تلہ گنگ ضلع کیمبل پور کے قصبہ ''تھوہا محرم خان'' سے ہے۔ یہ قصبہ آپ کے اسلاف کا مسکن تھا۔ آپ نسلاً راجپوت (جاٹ) ہیں۔ ''جیپ'' آپ کی گوت ہے۔ آپ کے خاندان میں مقتدر اور معروف شخصیت مولوی عبدالرحیم کی ہے جن کے تین فرزند تھے (۱) مولوی محمد اکرم (۲) مولانا محمد حسن (۳) مولانا محمد محسن رحمہم اللہ۔ مولانا محمد اکرم کے چار صاحبزادے تھے۔ مولوی محمد احسنؒ، مولانا کلیم اللہؒ، مولانا محمد یٰسینؒ اور سب سے چھوٹے حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کے والدِ بزرگوار حافظ احمدؒ۔ حافظ احمد صاحبؒ کی خالہ ''ڈھڈیاں'' (ضلع سرگودھا) بیاہی ہوئی تھیں جن کی فرمائش پر حافظ احمد صاحبؒ تھوہا محرم خان سے ڈھڈیاں'' منتقل ہوئے اور اس طرح موضع ڈھڈیاں کو ہی حضرت مولانا عبدالقادر کا مولد اور وطن بننے کا شرف حاصل ہوا۔

حافظ احمد صاحب کی پہلی شادی ڈھکوال میں ہوئی جو ڈھڈیاں سے ۴ میل کے فاصلے پر ضلع سرگودھا میں ہے۔ اس سے حافظ احمد صاحب کے ہاں کوئی نرینہ اولاد نہ ہوئی۔ ساٹھ برس کی عمر میں آپ کی ملاقات ایک بزرگ مجذوب سے ہوئی۔ جس نے آپ سے دوسری شادی کے لیے کہا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ''میں تمہاری پشت سے ایک ایسا نور دیکھتا ہوں جس سے ایک عالم منور ہوگا (حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری۔ ابوالحسن ندوی، لاہور ص ۳۷) چنانچہ اس فرمائش کے تحت حافظ احمد نے موضع للیانی ضلع سرگودھا کے ایک معزز خاندان میں شادی کی۔ اس شادی سے (۱) مولانا عبدالقادر (۲) حافظ عبدالعزیز (۳) حافظ محمد خلیل (۴) ایک بیٹی پیدا ہوئی۔

پیدائش اور ابتدائی تعلیم:

آپ کا سنِ پیدائش صحیح طور پر کسی کو یاد نہیں۔ مولانا سید ابوالحسن ندویؒ نے اپنی کتاب ''حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری'' میں آپ کا سنِ پیدائش اندازاً ۱۲۹۰ھ بمطابق ۱۸۷۳ء تحریر کیا ہے۔ والد ماجد نے آپ کا اسم گرامی غلام جیلانی رکھا، بعد میں آپ کے مرشد حضرت مولانا عبدالرحیم رائے پوریؒ نے تبدیل کر کے عبدالقادر رکھ دیا۔ آپ اسی نام سے پورے حلقۂ ارادت میں جانے جاتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے چچا حافظ محمد یٰسین اور مولانا کلیم اللہ سے حاصل کی۔ مولانا کلیم اللہ سے قرآن مجید حفظ کیا۔ اس زمانے میں موضع ڈھڈیاں کے قریب ''بھرت شریف'' اور ''جھاوریاں'' دو تعلیمی مرکز تھے آپ نے دونوں مراکز سے کسبِ فیض کیا۔

ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے سہارن پور تشریف لے گئے جہاں مولانا ثابت علی سے شرح جامی پڑھنے کا قصد تھا۔ سہارن پور میں مولانا حبیب الرحمٰن سہارن پوریؒ سے بھی تعلیم حاصل کی اور یہیں پر ایک مسجد میں امامت کے فرائض بھی سرانجام دیئے اسی جگہ آپ کی حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ سے پہلی ملاقات ہوئی۔ لیکن اس وقت کسی کو اس بات کا خیال بھی نہ تھا کہ انہی سے آپ کا رشتۂ تصوف استوار ہوگا اور آپ ان کے جانشین کی حیثیت میں پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی دل کی دھڑکن بن جائیں گے۔

کچھ عرصہ بعد پانی پت میں مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ سے بھی شرح جامی پڑھی، آپ کے علاوہ مولانا راغب اللہ، مولانا لقاء اللہ، مولانا لطف اللہ رحمۃ اللہ علیہم سے بھی آپ نے تعلیم حاصل کی۔ پھر رام پور تشریف لے گئے۔ رام پور، معقولات و منطق کی تعلیم کے لیے ہندوستان بھر میں مشہور تھا۔ جہاں مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی پورے ہندوستان کے دینی طالب علموں کے لیے باعثِ کشش بن چکا تھا۔ یہیں پر مولانا محمد طیبؒ بھی تھے جو عرب تھے۔ ان دونوں حضرات سے آپ نے تعلیم حاصل کی۔ رام پور میں آپ کا قیام خاصا تکلیف دہ رہا۔ آپ خود فرماتے کہ میرا یہاں جی نہیں لگا شہر کی سڑکوں پر غریب ہندو کہار جو اُپلے بیچنے آتے، لوگ انہیں طرح طرح سے تنگ کرتے اور بعض اوقات ان کے اُپلے بھی چھین لیتے۔ میں اکثر اوقات سوچتا کہ ان زیادتیوں کا نتیجہ مسلمانوں کے حق میں کیا ہوگا؟ فرماتے کہ مجھے محلّہ سے روٹیاں اور ایک پیسہ روز ملتا تھا اس ایک پیسے سے چنے لے کر آتا انہیں ابال کر کھالیتا۔

حضرت رائے پوری فرماتے کہ رام پور سے کسی دوست نے خط لکھ دیا کہ غلام جیلانی کا انتقال ہوگیا ہے۔ مجھے علم ہوا تو میں نے خط لکھ دیا کہ میں زندہ ہوں۔ والدہ صاحبہ نے والد صاحب سے اصرار کیا کہ اس کو لے آؤ۔ والد صاحب رام پور تشریف لائے۔ انھوں نے آکر استاد سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ سبق کے لیے کہیں گیا ہے، لیکن وہ میری تلاش میں مدرسے سے نکل کر راستے میں مجھے ملے تو واپسی کا کہا۔ لیکن میں نے انکار کیا کہ حصول علم کے بعد ہی گھر جاؤں گا۔ آپ میرا جواب سن کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ میری بھی یہی خواہش ہے کہ تم علم حاصل کرو اور علم حاصل کرنے کے بعد ہی گھر آؤ۔

دہلی میں:

رام پور سے آپ نے مزید تعلیم کے لیے دہلی کا رخ کیا۔ دہلی کا یہ سفر غالباً ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۲ء کے درمیان پیش آیا۔ دہلی میں اس وقت شیخ الکل میاں جی حضرت سید نذیر حسینؒ کا درس علم حدیث کے طالب علموں کے لیے مرکز بنا ہوا تھا آپ اس میں بھی شریک ہوئے، پھر مسجد سنہری کا قصد کیا جہاں مدرسہ امینیہ میں حدیث کے اسباق ہوتے تھے۔ وہاں حضرت مولانا انور شاہ کاشمیریؒ درس دیا کرتے تھے۔ ان کے درس سن کر طمانیت ہوئی۔ دہلی اس وقت فقہی مسائل و عقائد کا اختلافی میدان بنا ہوا تھا۔ مناظرین اور واعظین ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے۔ آپ سب کی سنتے اور سوچتے رہتے۔ فرماتے کہ ایک فرقے کی بات سن کر معلوم ہوتا باقی تمام فرقوں والے مشرک ہیں۔ کفر کے تیر کثرت سے چلتے، دل کو گرچہ تکلیف ہوتی، تاہم متضاد باتیں سن کر طبیعت میں جامعیت اور اعتدال کی کیفیت محسوس ہونے لگتی اور احساس ہونے لگا کہ سبھی فرقے والے مبالغے اور تشدد سے کام لیتے ہیں جو درست نہیں۔

پانی پت، سہارن پور، رام پور اور دہلی کے علاوہ گلاوٹھی ضلع بلند شہر اور بانس بریلی میں بھی آپ نے تعلیم حاصل کی۔ بریلی میں آپ نے مدرسہ مصباح التہذیب میں تعلیم حاصل کی جہاں ان دنوں پنجاب کے مولوی محمد دین مرحوم پڑھایا کرتے تھے۔ مولوی خدایار مرحوم سے فلسفہ کی کتابیں پڑھیں۔

ملازمت:

بریلی ہی میں آپ کے تحصیل علم کا مرحلہ اختتام پذیر ہوا۔ یہیں آپ نے کچھ عرصے کے لیے مولوی خدایار مرحوم کے ہاں ان کے بیٹے مقتدا یار خان کو پڑھانے پر ملازمت اختیار کر لی۔ بریلی میں ہی آپ نے حکیم مختار احمد خان سے طب کی کتابیں شرح اسباب تک پڑھیں۔ آپ کی نیت یہ تھی کہ معاش کے لیے کوئی سلسلہ اختیار کر لیا جائے۔ چنانچہ آپ نے کسی دوست کے ذریعے افضل گڑھ ضلع بجنور کا بھی سفر کیا جہاں پر تقریباً چھے ماہ تک مطب میں مشغلہ رہا۔ بریلی کی ملازمت کے دوران ہی والد صاحب کے انتقال کی خبر ملی جس کے بعد آپ نے بریلی کی ملازمت کو ترک کر دیا۔

اضطراب و بے چینی، مرشد کی تلاش:

بریلی کے قیام کے دوران بے چینی اور اضطراب کی کیفیت میں مبتلا رہے، جو حصولِ یقین کامل اور روحانی ترقی کا ایک ابتدائی مرحلہ سمجھا جاتا ہے۔ صوفیاء کی سوانح سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ روحانی ترقی سے پہلے اکثر و بیشتر اس بے چینی اور اضطراب کی کیفیت کو محسوس کیا گیا۔ حضرت رائے پوریؒ فرماتے جب بھی مجھ پر شکوک کا حملہ ہوتا صحابہ کرام کے حالات پڑھ کر بڑا اطمینان ہوتا۔ یہ یقین پختہ ہوتا کہ یہ جماعت حق پر تھی اور دین اسلام سچا اور مقبول دین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت رائے پوری کی زندگی میں صحابہ کرام کے حالات کا اثر بڑی شدت کے ساتھ آخری دم تک رہا۔ صحابہ کرام کو اپنا مرشد اور ان کتابوں کو اپنا محسن مانتے تھے جن کے ذریعے آپ پر صحابہ کی عظمت اور دین اسلام کی حقانیت یقین کامل تک پہنچی۔

یہ مرزا غلام احمد قادیانی کا ابتدائی دور تھا اور پنجاب کے اندر اس کی دعوت اور دعویٰ کا چرچا ہر خاص و عام کی زبان پر تھا۔ مرزا غلام احمد کی کتابیں اور رسائل عموماً پڑھے جاتے تھے اور اس پر بحث و تمحیص اہل علم حضرات کا مشغلہ بن چکا تھا۔ ویسے بھی حکیم نور دین آپ کے وطن کے نزدیک بھیرہ ہی کا باسی تھا۔ حضرت کے خاندان کے بزرگوں کے ایک شاگرد حکیم نور دین کے خاص معاونین میں سے تھے جو مستقل طور پر قادیان میں قیام پذیر تھے۔ ان تمام حوالوں اور رابطوں کے ذریعے مرزا غلام احمد قادیانی کے مستجاب الدعا ہونے کا چرچا آپ تک بھی پہنچا تو آپ نے بھی ایک خط کے ذریعے دعا کے لیے تحریر کیا۔ جواب میں مولوی عبدالکریم کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط موصول ہوا کہ تمہارا خط ملا۔ دعا کے لیے

حضرت (مرزا غلام احمد) کو کہہ دیا ہے انھوں نے تمہارے لیے خوب دعا کی ہے۔ کبھی کبھی خط لکھ کر یاد دہانی کرا دیا کرو۔ حضرت رائے پوری خود فرماتے تھے کہ اس زمانے میں ایک پیسے کا کارڈ آتا تھا میں ہر چند دنوں کے بعد ایک کارڈ لکھ دیتا تھا۔ اسی دوران مرزا غلام احمد قادیانی کی چند کتابیں دیکھنے کا موقع مل گیا۔ میرے دل میں ان کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ قادیانیت کی جانب میرا میلان ہو گیا اور یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے یہ سچے ہوں۔ پھر خود ہی فرمایا کہ جب بھی مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہوتی دو رکعات نماز نفل پڑھ کر عاجزی کے ساتھ دعا کرتا تو طبیعت ان کی جانب سے متنفر ہو جاتی اور ایک سکون سا محسوس کرنے لگتا۔ فرماتے میرے مالک کا مجھ پر کتنا کرم ہے کہ بغیر دلیل کے مجھ پر حق واضح ہوتا چلا گیا۔

بریلی میں قیام کے دوران طبیعت کی بے چینی اور بے اطمینانی جب زیادہ بڑھ گئی تو امام غزالی کی کتاب ''المنقذ من الضلال'' کا اردو ترجمہ کہیں سے میسر آیا، جسے پڑھا۔ اس کتاب میں امام غزالی نے اپنی کیفیات کی کہانی تحریر کی ہے کہ کس طرح علم و فضل کے باوجود ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہم جو کچھ پڑھ پڑھا رہے ہیں سب بیکار اور فضول ہے ہم جسے دینی مشغلہ کہتے ہیں وہ محض دنیاداری اور دنیا طلبی ہے یہ سب کچھ دلی سکون و اطمینان کی طرف نہیں لے جا رہا بلکہ حقیقی معرفت کی دولت سے رفتہ رفتہ مجھے محروم کر رہا ہے۔ اسی سوچ میں امام غزالی کی زبان بند ہو گئی، اشتہا بالکل مفقود اور صحت جواب دے گئی۔ درس و تدریس کا سلسلہ محض خود فریبی ہونے لگا اور طبیعت بالکل اچاٹ ہو گئی۔ اس کیفیت میں اس قدر اضافہ ہوا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بغداد سے پیدل چل کھڑے ہوئے۔ برسوں تک صحرا نوردی اور مجاہدہ کے بعد یقین کی دولت نصیب ہوئی۔ انہیں یقین ہو گیا کہ صوفیاء کا راستہ ہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر انسان سیرت و اخلاق کے حوالے سے نبوت کی تقلید کا ملہ اور توجہ علی اللہ کی نعمت سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔

حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے کہ امام غزالی کی اس کتاب نے میرے دل میں ایسا انقلاب برپا کر دیا جس نے بڑی شدت سے مجھے مرشد کی تلاش کے لیے مجبور کر دیا۔ میں نے بھی امام غزالی کی طرح سفر اختیار کرنے کی ٹھان لی۔ اس دوران حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''تحفۃ العشاق'' کہیں سے مل گئی۔ اسے پڑھنے کے بعد بے چینی اور عشق کی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ مہینوں تک یہ معمول رہا کسی قبرستان میں چلا جاتا اور روتا رہتا۔

یہی وہ زمانہ تھا کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (مولانا رشید احمد گنگوہی) کا آفتاب رشد و ہدایت پورے عروج پر تھا۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی کتابوں کے مطالعے نے اسی سلسلے کی جانب رجوع کرنے پر آمادہ کیا۔ حضرت کے خلیفہ حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ اکثر اوقات پنجاب میں تشریف لاتے تھے اور آپ کے چند مریدین سے بھی ملاقات رہتی تھی۔ چنانچہ آپ کی ہی خدمت میں ایک خط تحریر کیا۔ جس میں بیعت کے لیے عرض کیا۔ خط کا جواب ملا۔ ''حدیث میں آتا ہے ''المستشار مؤتمن'' میں آپ کو لکھتا ہوں کہ میں کوئی چیز نہیں ہوں آپ میں طلب ہے مجھ میں یہ بھی نہیں آپ حضرت گنگوہیؒ کی طرف رجوع کریں''۔ اس جواب نے مجھے اور زیادہ متاثر کیا کہ اخلاص اور بے نفسی اس کو کہتے ہیں۔ حضرت ایک مرتبہ مولانا رشید احمد گنگوہی کی زیارت کر چکے تھے۔ اس لیے آپ کی شان اور مرتبے سے ناواقف نہیں تھے لیکن آپ نے یہ محسوس کیا کہ ایسے مرجع خلائق اور شہرۂ آفاق شیخ سے جو اپنی عمر کے آخری حصے میں ہیں مجھ ایسا کم مایہ اور نو وارد طالب کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے اور کس طرح اپنی اصلاح باطن کے لیے شیخ کی خصوصی توجہ اپنی جانب مبذول کرا سکتا ہے۔ آپ نے فیصلہ کیا کہ مجھے حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کا ہی دامن پکڑنا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آپ رائے پور حاضر ہوئے اور بیعت کی درخواست کی۔ حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ نے فرمایا جلدی کیا ہے۔ استخارہ کر لو آپ نے گھر جانا ہے گھر سے ہو آؤ پھر بیعت کر لینا۔

قادیان میں:

حضرت واپس گھر آ گئے اور چند روز تک ڈھڈیاں میں قیام کیا۔ اس دوران حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کی ہدایت کے مطابق بڑی یکسوئی کے ساتھ ذکر و فکر کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ان دنوں کے بارے میں آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو مزہ ان دنوں میں آیا۔ پھر نہیں آیا۔ کہا کرتے کہ جو بات ان دنوں میں میسر آئی پھر کبھی نہ آئی۔ عموماً کہا کرتے ''دیکھا جو کچھ دیکھا، پایا جو کچھ پایا'' انہی دنوں میں آپ کو حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت نصیب ہوئی۔ چند دن ڈھڈیاں میں قیام کے بعد رائے پور واپس جانے کا قصد کیا تو کسی قریبی رشتہ دار کی فرمائش پر قادیان میں حکیم نور دین سے ملاقات ہوئی۔ جس کا ذکر مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب ''سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری'' کے صفحہ ۶۰ پر اس طرح کرتے ہیں۔

''ڈھڈیاں سے واپس رائے پور کا عزم کیا تو واپسی کے لیے کرایہ نہیں تھا اور گھر میں بھی نہیں تھا۔ آپ کے بھائی عبدالعزیز کے پاس ایک بکری تھی اس کو بیچ کر روپے حضرت کو دیئے۔ فرمایا ہم نے تو نیت کر لی تھی کہ پیدل ہی رائے پور جائیں گے مگر بھائی نے احسان کیا اور ہم جلد ہی رام پور پہنچ گئے۔

رائے پور کا قصد فرمایا تو چچازاد بھائی مولوی سعد اللہ کے بیٹے مولوی امام دین نے جو بیمار تھے فرمائش کی کہ راستے میں حکیم نور دین کو دکھاتے چلو، والد صاحب کے شاگرد حافظ روشن دین ساتھ تھے آپ کے ایک ساتھی مولوی صدیق جو اہل حدیث تھے وہ آپ کے ساتھ دہلی میں اکٹھے رہے تھے۔ حکیم صاحب سے آپ کا ذکر کیا تھا اور تعارف کرایا تھا کہ آپ کے استادوں کے خاندانوں میں سے ہیں۔ حکیم نور دین نے لکھا بھی کہ تم ایک مرتبہ مرزا کے پاس آ جاؤ۔ غرض آپ قادیان گئے اور سات آٹھ روز تک حکیم صاحب کے ہی مہمان رہے۔ ایک مرتبہ راقم السطور کے اس سوال پر کہ حکیم صاحب مخلص تھے؟ آپ نے قادیان کے سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے تفصیل سے اس کا قصہ سنایا، ارشاد فرمایا:

''مولوی عبدالرحمٰن کے والد امام الدین جب بیمار ہوئے تو مجھ سے کہا کہ مجھے حکیم نوردین کے پاس لے چلو،
میں لے گیا، عصر کے بعد ان کی عام مجلس ہوا کرتی تھی قسم قسم کے لوگ آتے، پوچھتے پاچھتے رہتے۔ جب تنہائی ہوئی تو میں نے پوچھا کہ آپ جو کہتے ہیں کہ حق صرف ہمارے ہی پاس ہے اور باقی سب باطل ہیں اور قرآن ان کے دلوں میں نہیں اترا ہے تو اس کی کیا دلیل ہے کہ آپ ہی حق پر ہیں؟ اور دوسرے باطل پر۔ انہوں نے کہا کہ مجھے تو مرزا نے کہا تھا کہ آریوں اور عیسائیوں کے رَد میں کتاب لکھو میں نے لکھی۔ میرا سلوک تو اسی طرح سے طے ہو گیا تو میں نے کہا کہ انوار تو دوسروں کو بھی نظر آتے ہیں حتیٰ کہ ہندوؤں کو بھی' وہ خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد کہا ہم سے مکالمۂ باری ہوتا ہے اس پر میں خاموش ہو گیا' کیونکہ مجھے معلوم نہ تھا کہ دوسروں کو مکالمۂ باری ہوتا ہے یا نہیں۔ میں چونکہ رائے پور سے ہو کر آیا تھا میں نے اتنا کہا کہ تم حق پر ہو یا نہ ہو بہر حال جس شخص کو میں نے دیکھا وہ ضرور باطل پر نہیں ہے۔ یقیناً حق پر ہے۔ میں نے حضرت (شاہ عبدالرحیم قدس سرہ) کو قرآن مجید پڑھتے بھی دیکھا تھا۔ تہجد میں طویل تلاوت فرماتے تھے۔ کبھی رو رہے ہیں۔ جب عذاب کا ذکر آتا تو رو رو کر استغفار پڑھتے ہاتھ جوڑ رہے ہیں اور سکوت ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بھی غلط ہے کہ دوسروں کے دل میں قرآن ہی نہیں اُترا۔ اگر میں نے حضرت کو نہ دیکھا ہوتا تو قادیانی بن گیا ہوتا''۔ حکیم نورالدین کی مجلس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ کچھ کچھ وقفے کے بعد بڑے درد سے **لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین** اس طرح پڑھتے کہ دل کھنچتا تھا۔ مجھے خیال ہوتا کہ ان کو ایسی رقت اور انابت ہوتی ہے یہ کیسے ضلالت پر ہو سکتے ہیں؟ مگر اس کے ساتھ دل میں آتا کہ میں اللہ کے جس بندے کو دیکھ کر آیا ہوں۔ اگر اللہ تعالیٰ رحمٰن و رحیم ہے اور یقیناً ہے تو اس کو ضلالت میں نہیں چھوڑ سکتا۔ اس سفر میں مرزا سے ملاقات ہوئی۔ فرماتے تھے کہ میں ان کے امام کے پیچھے بھی نماز پڑھتا تھا اور اپنی الگ بھی پڑھتا تھا۔

قادیان میں چند روز قیام کے بعد آپ کے ساتھی واپس چلے گئے اور آپ سہارن پور کے لیے روانہ ہوئے۔ رخت سفر اس قدر مختصر تھا کہ ٹکٹ کے علاوہ پاس کچھ نہیں تھا۔ لیکن راستے میں کھانا کھانے کی نوبت ہی نہ آئی۔ جب سہارن پور پہنچے تو کھانا کھایا۔ دو چار وقت گزر چکے تھے سہارن پور میں کسی سے ملاقات کئے بغیر آپ پیدل ہی رائے پور روانہ ہو گئے منہ کا مزہ انتہائی تلخ ہو چکا تھا۔ راستے میں آپ کہتے ہیں کہ ایک مسجد میں ذرا رکے اور وہاں پر آرام کیا۔ ایک آدمی آیا اور اس نے پوچھا یہاں سے کہاں جاؤ گے؟ جواب میں آپ نے کہا کہ مسافر ہیں اِدھر سے آئے اُدھر کو چلے جائیں گے۔ آپ سے کیا؟ آخر حضرت کی خدمت میں بخیریت پہنچ گیا۔

حضرت نے مجھ سے ذکر کی کیفیت کے بارے میں پوچھا تو میں نے کہا حضرت میں تو غبی ہوں۔ میرے اندر کچھ نہیں ہے۔ پھر جو کیفیت پائی عرض کی۔ فرمایا الحمدللہ۔ اسی کیفیت میں بیعت سے مشرف ہوئے اور قیام کا ارادہ فرمالیا۔

حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری نے فرمایا کہ مولوی صاحب آپ کے پیچھے کتنے لوگ ہیں جواب میں حضرت عبدالقادر رائے پوری نے فرمایا والدہ ہیں، بیوی، دو بھائی اور دو بہنیں۔ فرمایا یہ تو بڑا کنبہ ہے۔ ہمارا تو جی چاہا تھا کہ ہم اکٹھے رہتے۔ عرض کیا کہ سب کے ہوتے ہوئے بھی میرا کوئی نہیں ہے۔ میں تو یہ نیت کر کے آیا ہوں کہ ساتھ ہی رہوں گا۔

فرمایا کہ ایک مرتبہ مناسب موقع دیکھ کر میں نے اپنے حضرت قدس سرہٗ سے عرض کیا کہ قادیانی انوار کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کو نماز وغیرہ میں بہت حالات و کیفیات پیش آتے رہتے ہیں اور گریہ وخشیت کا غلبہ ہوتا ہے اس کا کیا سبب ہے؟ حضرت سنبھل کر بیٹھ گئے اور جوش سے فرمایا مولوی صاحب سنو

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدیٰ ویتبع غیر سبیل المؤمنین نوله ما تولی

حضرت اس کی تشریح فرمانا چاہتے تھے۔ حضرت بس میں سمجھ گیا۔ اس کے بعد اس مسئلہ میں کبھی کوئی کھٹک نہیں ہوئی۔

ضلالت کی صورت میں بھی جو لوگ مجاہدے اور محنت میں لگے رہتے ہیں۔ ان کیلئے بھی ایسی صورتیں اور آثار ظاہر ہوتے ہیں جن سے ان کو اپنے مسلک کی تائید اور اس پر اطمینان حاصل ہوتا ہے اور اس میں اور زیادہ پختہ ہو جاتے ہیں۔ اسی کا نام قرآن مجید کی اصطلاح میں استدراج بھی ہے۔ اس لیے محض کشوف و انوار اور کیفیات و آثار حقانیت کا معیار نہیں۔ اصل معیار کتاب وسنت اور مسلکِ سلف سے مطابقت ہے۔

قیام پاکستان کے بعد:

قیام پاکستان کے بعد بھی اگرچہ آپ کا صدر مقام رائے پور ہی رہا لیکن پاکستان کے اندر بھی ہر جگہ آپ کے ارادت مند پھیلے ہوئے تھے۔ جن کی روحانی پیاس بجھانے کے لیے آپ اکثر و بیشتر پاکستان تشریف لاتے۔ معمول یہ تھا کہ (پاکستان تشریف لاتے اور پاکستان کے اندر مختلف مقامات پر کئی کئی ماہ قیام فرماتے۔ اس دوران پورے ملک کے اندر پھیلے ہوئے عقیدت مند ہر جگہ سے آپ کے ہاں جوق در جوق تشریف لاتے اور اپنی استطاعت کے مطابق آپ کی روح پرور محفلوں میں بیٹھ کر آپ کے فیوض و برکات سے استفادہ کرتے۔ ہر دفعہ قیام پاکستان کے دوران کئی نئے لوگ آپ کی بیعت سے مشرف ہو کر حلقۂ ارادت میں شمولیت اختیار کرتے جس جگہ بھی آپ کا قیام ہوتا وہ جگہ ایک خانقاہ کی شکل اختیار کر لیتی تھی اور آنے والوں کا تانتا بندھ جاتا تھا۔ ہر وقت آپ کی موجودگی میں ذکرِ الٰہی سے فضا معمور اور دل مسحور رہتے۔

تقسیم ملک کے بعد آپ پہلی دفعہ ربیع الاوّل کے مہینے میں غالباً ۱۳۶۸ھ بمطابق ۱۹۴۹ء پاکستان تشریف لائے۔ دہلی سے کراچی پہنچے اور کراچی سے ملتان اور ملتان

سے فیصل آباد (لائل پور) کچھ دن قیام کر کے آپ ۲۰ رفروری ۱۹۴۹ء کو اپنے وطن ڈھڈیاں تشریف لے گئے۔ ۱۹۴۹ء کے بعد آپ مسلسل پاکستان تشریف لاتے۔ کئی جگہوں پر قیام رہتا لیکن سب سے زیادہ قیام لاہور میں ہی ہوتا تھا۔ دوسری دفعہ جب آپ ۱۹۵۱ء میں پاکستان تشریف لائے تو آپ کا قیام صوفی عبدالحمید کی کوٹھی پر تھا جو پنجاب لیگی حکومت میں غالباً وزیر بحالیات تھے۔ ابن امیر شریعت سید عطاء المہیمن شاہ صاحب بخاری فرماتے ہیں کہ اس بات کا علم جب امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کو ہوا کہ حضرت لاہور میں تشریف لے آئے ہیں۔ اور قیام ان کا لیگی وزیر کے ہاں ہے تو آپ بڑے بے چین اور مضطرب رہے کہ لیگی وزیر کے ہاں کس طرح جاؤں لیکن جلد ہی اپنے پیر و مرشد کی محبت اور عقیدت غالب آئی اور آپ نے اس بات کا فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے پیر و مرشد کو ملنے کے لیے جہاں بھی ہیں جائیں گے۔ چنانچہ جب آپ صوفی عبدالحمید کو کوٹھی پر تشریف لے گئے تو اسے اتفاق کہہ لیجئے یا پھر کچھ اور نام دے لیجئے کہ صوفی عبدالحمید صاحب اپنی کوٹھی کے مرکزی دروازے پر امیر شریعت کے استقبال کے لیے پہلے سے ہی موجود تھے۔ انہوں نے مسکرا کر بڑی تعظیم کے ساتھ آپ کو خوش آمدید کہا اور کہا کہ میرے لیگی ہونے کا اپنے ذہن پر کوئی اثر نہ لیں میں تو آپ کا بھی عقیدت مند ہوں اور آپ کی دینی سیاسی خدمات کا دل و جان سے معترف ہوں اور اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ آپ پیر و مرشد کو ملنے کے لیے میرے گھر تشریف لائے۔ جس کے بعد امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی وہ کیفیت جاتی رہی جس کا پہلے ذکر ہوا ہے۔ صوفی عبدالحمید کی کوٹھی کے بارے میں مولانا ابوالحسن علی ندوی تحریر کرتے ہیں،

''یہ کوٹھی کثیر التعداد اور وسیع کمروں اور ایوانوں، ڈارائنگ روم اور متعدد غسل خانوں پر مشتمل ہے۔ جس میں بیک وقت سو ڈیڑھ سو آدمی گذارا کر سکتے ہیں۔ کوٹھی میں ایک وسیع چمن اور سبزہ زار ہے۔ ایک ایک وقت میں سو سو مہمان ہو گئے۔ صوفی صاحب کے متعلقین اوپر کی منزل میں منتقل ہو جاتے اور خود نیچے کی منزل میں ایک چھوٹے سے کمرے پر قناعت کرتے اور پوری کوٹھی آنے والے مہمانوں اور اللہ اللہ کرنے والے دوستوں کے حوالے کر دیتے جو درویشانہ اور متوکلانہ جہاں جگہ پاتے پڑ جاتے۔ نمازوں کے وقت کمروں کی حدود ختم ہو کر دور دور تک صفیں ہوتیں اور مکبر مقرر ہوتے۔ گرمیوں میں باہر وسیع سبزہ زار اور سردیوں میں اندر زیر سقف مجلس ہوتی۔ شام کی مجلس میں شہر کے مقتدر اہل علم و صلاح اور بعض مرتبہ مشاہیر و عمائد شہر بھی ہوتے۔ لاہور کے علماء مشائخ و مشاہیر میں حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری رحمۃ اللہ علیہ اکثر صبح کے وقت اور بعض مرتبہ شام کی مجلس میں بڑے اہتمام سے تشریف لاتے۔ مؤدب اور دوزانو خاموش مراقب بیٹھ جاتے۔ اگر حضرت کچھ سوال کرتے تو خاموش اور نہایت اختصار کے ساتھ جواب دیتے ورنہ بالکل خاموش رہتے۔ مولانا کے علاوہ سلسلۂ دیوبند کے دوسرے متعدد علماء و اساتذہ آتے رہتے بعض اوقات لاہور اور پنجاب کے اتنے اہل علم، اعلیٰ عہدے دار، سیاسی رہنماء اور قومی کارکن جمع ہو جاتے جن کا ایک جگہ دوسرے مقام پر بیک وقت جمع ہونا مشکل سمجھا جاتا ہے۔ ان میں بڑی تعداد احراری علماء اور رہنماؤں کی ہوتی۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی تشریف لایا کرتے اور ہفتوں قیام فرماتے اور مجلس میں بلبل کی طرح چہکتے۔ ان کی موجودگی اور شیریں نوائی سے لطف صحبت دوبالا ہو جاتا۔ حضرت کی بشاشت اور شیفتگی بھی ان کی موجودگی سے بڑھ جاتی۔''

(سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوری، مولانا ابوالحسن ندوی، صفحہ ۹۰۔۱۸۹)

ایک مرتبہ راقم کو بھی اس مجلس میں شرکت کا موقعہ اللہ تعالیٰ نے میسر فرمایا۔ میں ان دنوں حصولِ تعلیم کے سلسلے میں لاہور میں، ۴ مزنگ روڈ پر جناب خضر تمیمی کے دفتر میں اپنے دوست پروفیسر ممتاز سہارن کے ساتھ مقیم تھا کہ اعلان ہوا مولانا ابوالکلام آزاد کی غائبانہ نماز جنازہ موچی دروازے کے باہر پڑھائی جائے گی۔ میں اپنے دوست کے ہمراہ موچی دروازے پہنچا اور اس جنازے میں شرکت کی۔ یہیں پر مجھے معلوم ہوا کہ میرے پیر و مرشد امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی لاہور میں تشریف لائے ہوئے ہیں اور وہ ریڈیو پاکستان کے ساتھ حاجی عبدالمتین صاحب کی کوٹھی پر قیام پذیر ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنے دوست سے کہا کہ میں چلا اپنے پیر و مرشد کے پاس آپ کا کیا پروگرام ہے؟ اس نے کہا کہ چلو میں بھی آپ کے ساتھ ہی چلتا ہوں چنانچہ ہم دونوں پیدل موچی دروازے سے حاجی عبدالمتین کی کوٹھی پر پہنچے تو پتا چلا کہ امیر شریعت یہاں پر قیام پذیر نہیں ہیں بلکہ وہ تو صوفی عبدالحمید کی کوٹھی جو کہ جیل روڈ پر ہے وہاں اپنے پیر و مرشد کے ساتھ قیام پذیر ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں صوفی صاحب کی کوٹھی پر پہنچے۔ کوٹھی کے اندر داخل ہوئے تو کشادگی، وسعت اور اس کے سبزہ زار سے انتہائی متاثر ہوئے۔ مرکزی دروازے سے لے کر عمارت تک ایک لمبا فاصلہ طے کیا تو باہر امیر شریعت علیہ الرحمۃ چند عقیدت مندوں کے درمیان تشریف فرما تھے۔ میں نے انتہائی ادب و احترام کے ساتھ سلام عرض کیا تو فرمانے لگے تم یہاں پر بھی آ پہنچے۔ جواب میں، میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کے لیے آج کافی پیدل سفر کرنا پڑا۔ بڑی مشکل سے آپ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا کہنے لگے کہ مجھ پہ کیا احسان کیا اچھے خاصے صحت مند اور جوان ہو مجھے دیکھو کہ میں نے آج اس پیرانہ سالی میں ہسپتال میں اپنے دانتوں کے لیے تین منزلہ سیڑھیاں چڑھنے کا کٹھن کام کیا۔ اس کے باوجود دیکھو ٹھیک ٹھاک بیٹھا باتیں کر رہا ہوں۔ باتیں کیا تھیں مولانا ابوالکلام کی شخصیت پر امیر شریعت کی زبان و بیان ایک عجیب و غریب تاثر پیدا کر رہا تھا۔ فرما رہے تھے کہ

''عربی مولانا کی مادری زبان تھی۔ فارسی ان کے گھر کی لونڈی اور اردو ان کے در کی باندی اور انگریزی اتنی اچھی جانتے تھے کہ مجھے مخاطب ہو کر کہنے لگے ''بابو تم بھی کیا جانو گے۔''

کافی دیر تک مولانا کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے رہے اور یہ بھی کہا کہ ''حکومت ہندوستان کا یہ کوئی آپ پر احسان تھا کہ ان کے وزیر تعلیم تھے وہ تو ابوالکلام کا بھارتی حکومت پر احسان تھا کہ وہ ان کے وزیر تعلیم تھے۔''

ابھی یہ باتیں ہورہی تھیں کہ ایک آدمی آیا اور امیر شریعت سے کہا کہ شاہ جی حضرت آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔ میں نے دیکھا تو امیر شریعت کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوا، ننگے سر تھے فوراً آپ نے اپنا سر بڑے رومال سے ڈھانپ لیا اور حضرت جو کہ ایک کمرے میں تھے ادھر چل دیئے۔ ہم دونوں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ آپ کے پیچھے کمرے تک پہنچے تو اندر کیا دیکھا کہ ایک بڑے سے پلنگ پر ایک کونے پر حضرت رائے پوری تشریف فرما تھے اور کمرہ اپنی وسعت کے باوجود لوگوں کی کثرت کیوجہ سے تنگ تھا۔ ہم تو دروازے پر ہی رُک گئے کہ اندر جگہ نہیں تھی۔ امیر شریعت نے حضرت کو سلام عرض کیا اور بڑی خاموشی سے پلنگ کے ساتھ نیچے بیٹھنے لگے تو حضرت رائے پوری نے فرمایا کہ ''نہیں شاہ جی آپ اوپر میرے پاس پلنگ پر بیٹھیں امیر شریعت تعمیل ارشاد کرتے ہوئے پلنگ پر دوسرے کونے پر بیٹھ گئے حضرت رائے پوری نے فرمایا ''شاہ جی میں نے آپ کو اس لیے بلوایا ہے کہ آپ ان لوگوں کو وعظ فرمائیں ''۔ آپ نے وعظ فرمایا۔ ہم دیر تک پیر و مرید دونوں کو باری باری دیکھتے اور شاہ کے وعظ سے مستفیض ہوتے رہے۔ جس کے بعد واپس آ گئے کہ اندر تو تل دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی۔

قیام پاکستان کے دوران دو اضافے:

مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی اسی کتاب کے صفحہ ۱۹۱ پر تحریر فرماتے ہیں:

''پاکستان کے دوران قیام دو نئی باتوں کا اضافہ ہو جاتا ایک تو یہ کہ پاکستان پہنچ کر تحریک قادیانیت کے خطرات اور اس کے دوررس اثرات کا احساس (جو کبھی فراموش اور نظر انداز نہیں ہوتا تھا) تازہ ہو جاتا اور طبیعت مبارک پوری قوت و ہمت کے ساتھ اس کے مقابلے، تردید اور ملک کی اس سے حفاظت کی ضرورت کی طرف متوجہ ہو جاتی اور یہ مسئلہ مجالس اور گفتگو کا سب سے بڑا موضوع بن جاتا۔ علماء اور زعمائے احرار اس سے (جن کو اللہ تعالیٰ نے اس فتنہ کے مقابلے کی خصوصی توفیق عطا فرمائی ہے اور حضرت نے اس کو ''جہادِ اکبر'' پر مامور فرمایا ہے۔) آجاتے تو ہر گفتگو ختم ہو کر بے اختیار ہی موضوع چھڑ جاتا۔ خصوصاً مولانا محمد علی جالندھری، مولانا لال حسین اختر اور قاضی احسان شجاع آبادی کی تشریف آوری تو گویا دل کا ساز چھیڑ دیتی اور اس موضوع کے سوا دوسرا موضوع سخن نہ رہتا۔ ان حضرات کی کارگزاری سے ان کی ہمت افزائی اور تحسین فرماتے اور نئی تحقیقات، معلومات دریافت فرماتے۔ مولانا محمد حیات جو قادیانی لٹریچر کے حافظ اور قادیانیت کا دائرہ معارف (انسائیکلوپیڈیا) میں تشریف لاتے تو گویا ردِّ قادیانیت کی کتاب کھل جاتی۔ ہمہ تن گوش اور سراپا ذوق ہو کر ان کی نادر تحقیقات اور زندگی کے تجربات سنتے اور کسی طرح ان کی گفتگو سے سیر نہ ہوتے۔ حضرت کو اسی محفل میں کھل کھلا کر ہنستے اور لطف و مسرت کا اظہار کرتے دیکھا گیا۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری وقتاً فوقتاً مجلس کو اپنے لطائف اور قادیانیت پر تبصرہ زعفران زار اور باغ و بہار بناتے۔ حضرت اس میں کوئی مداخلت گوارہ نہ فرماتے اور گویا کیفیت یہ ہوتی

''وہ کہیں اور سنا کرے کوئی''

تقسیم کے بعد حضرت کے سفر و قیام کا بڑا زمانہ سکندر مرزا کے اقتدار اور پاکستان میں شیعیت کے فروغ و انتشار کا زمانہ تھا۔ پنجاب میں جا بجا شیعیت کی تبلیغ اور صحابہ کرام کی توہین کا مشغلہ جاری تھا۔ حکومت کا رویہ اور حکام کی چشم پوشی اور بعض جگہ اہل تشیع کی حمایت اہل سنت کے لیے بڑی شکایت اور رنج کا موجب بن گئی۔ حضرت سے تعلق رکھنے والے متعدد علماء اور احراری رہنما بالعموم حفاظتِ ناموس صحابہ اور شیعیت کے بڑھتے ہوئے اثرات کا مقابلہ کرنے میں مشغول تھے اور انہوں نے جا بجا اس کے مرکز اور اس مقصد کے لیے انجمنیں قائم کر رکھی تھیں۔ حضرت کی آمد کے موقع پر یہ حضرات اکثر تشریف لاتے اور ملک کے افسوسناک حالات سناتے اور حکام کے تغافل یا شیعیت کی حمایت کی شکایت کرتے۔ حضرت سنِ شعور سے صحابہ کرام کی محبت و عظمت کا غلبہ تھا۔ اکثر فرمایا کرتے کہ صحابہ کرام کی وجہ سے ہم مسلمان ہیں یہی ہمارے مرشد اور ہادی ہیں۔ پاکستان پہنچ کر اور شیعیت کی تبلیغ اور صحابہ کی توہین کے واقعات سن کر آپ پر صحابہ کرام کی محبت کا جذبہ بہت غالب آجاتا۔ بالعموم ان دوستوں سے جو خود شاعر تھے یا دوسرے شاعروں کے اشعار خوش الحانی سے پڑھتے تھے فرمائش کر کے صحابہ کرام کی مدح اور خصوصیت کے ساتھ خلفائے راشدین اور ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی منقبت میں اشعار سنتے اس وقت آپ پر محبت کا عجب غلبہ اور عجب محویت و کیفیت طاری ہوتی۔ ایک زمانہ میں مشکل سے کوئی دن اس سے خالی جاتا۔ رات کو اکثر سونے سے بیشتر اشعار سنتے آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر گہرا اثر ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان اشعار کا سننا درد کی دوا اور روح کی غذا بن گئی ہے۔''

اکابر شیوخ کی نیابت میں:

اگر ہندوستان کے اکابر شیوخ کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ ہماری اس دھرتی کے متعدد شیوخ جن میں خاص طور پر حضرت خواجہ نظام

الدین اولیاء حضرت مجدد الف ثانی، شاہ کلیم اللہ جہان آبادی، حضرت شاہ ولی اللہ، ایسے حضرات ہیں کہ جنہوں نے ہندوستان کی سرزمین پر دین اسلام کی تعلیمات سے اسلام کو پھیلایا اور ہزاروں لاکھوں غیر مسلم ان کے ہاتھوں پر مسلمان ہوئے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی واضح ہے کہ ان حضرات نے ہی اسلام کو مختلف تحریکوں کے ذریعے اس وقت بچایا بھی جب کہ مسلمانوں پر کوئی مشکل وقت آیا ان حضرات نے گوشہ عزلت یا پھر اپنے مرکز ارشاد و تربیت میں بیٹھ کر بھی بڑی بڑی انقلاب انگیز تحریکوں کی سرپرستی کی۔ وقت کے فتنوں کا مقابلہ کیا ایسے فتنے جو مسلمانوں کو دین اسلام سے متنفر کرنے کے لیے مختلف انداز میں برپا کیے گئے۔ یہ حفاظتِ اسلام کا ایک اہم فریضہ تھا جو ان حضرات نے سرانجام دیا۔ ان کی تحریک اور ان حضرات کی ترغیب، ان کی نگرانی اور ان کی ہدایات کی روشنی میں ہی ان خدشات کا سدِ باب ہوا جو اس وقت بھارت کی سرزمین پر مسلمانوں کو درپیش تھے۔

دیکھنے والوں کی نگاہ میں صرف وہ تحریکیں تھیں جس میں تمام مسلمان رضا کاروں کی حیثیت میں ہر طرح کی قربانی پیش کر رہے تھے، لیکن جو لوگ حقیقت حال سے واقف ہیں وہ اس بات کو بڑی اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ ان تحریکوں میں کام کرنے والے جاں نثاروں کی ڈور کن کے ہاتھ میں تھی۔ وہ کون لوگ ہیں جن کا اخلاص، سوزِ دروں، جن کی حکمت و فراست کام کرنے والوں سے ایک ایسا کام لے رہی تھی جس کی وجہ سے سرزمین پاک و ہند میں دین اسلام اور مسلمانوں کے اعتقادی سرمایے کی حفاظت کا سامان مہیا ہوا۔

حضرت عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نے اگرچہ اپنے شیخ کی نیابت و وراثت میں اور ان شیوخ متقدمین جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے تقلید و اتباع میں اپنے لیے گوشہ عزلت کا انتخاب کیا تھا اور بظاہر صرف سلوک و تربیت سے ہی تعلق رکھا تھا لیکن انہوں نے اس کے ساتھ ساتھ اپنے اسلاف کرام کی تقلید اور نیابت میں متعدد دینی تحریکوں اور خدمت دین اور حفاظت اسلام کے مختلف کاموں کی سرپرستی بھی فرمائی۔ جس کی تفصیلات ابھی تک عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ اس کے باوجود مجلس احرار اسلام جو آزادی ہند اور قادیانیت کے رد میں دیگر تمام دینی جماعتوں سے ایک منفرد اور ممتاز حیثیت اختیار کر چکی ہے کہ آپ کی طرف سے سرپرستی کرنا تو ایک واضح حقیقت ہے جس سے کوئی انکار تو کیا انکار کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کے صفحہ نمبر ۲۹ پر اس طرح ذکر کرتے ہیں۔

تحریک احرار:

احرار کی تحریک اگرچہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور چودھری افضل حق مرحوم کی سیاسی ذہانت اور مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے اخلاص، جوش اور سحر بیانی کا نتیجہ تھی۔ لیکن اس کے قالب میں جو دینی روح تھی وہ حضرت کے ہی تعلق اور اخلاص اور درد کا پرتو تھی۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہما اللہ نہ صرف حضرت سے بیعت و انتساب کا تعلق رکھتے تھے۔ بلکہ ان کو حضرت سے اور حضرت کو ان دونوں سے بہت گہرا تعلق تھا اور ان دونوں کے علاوہ احرار کے بیشتر علماء و رہنما حضرت سے بیعت و تربیت کا تعلق رکھتے تھے۔ حضرت کو احرار کی تحریک اور جماعت سے بڑی توقعات تھیں۔ اس تحریک میں دین و سیاست کا امتزاج، عوام سے تعلق اور اس کے رہنماؤں کا جذبۂ حریت و جہاد، انگریز دشمنی اور ان کی جرات و ہمت حضرت کے مزاج سے بہت مناسبت رکھتی تھی اور حضرت کو یہ امید تھی کہ اس جماعت کی کامیابی سے دین کا دائرہ اثر وسیع ہو گا۔

لادینی سیاسی تحریکات کے خراب اثرات سے محفوظ رہیں گے۔ جاننے والوں میں سے کوئی بھی اس بات کا انکار نہیں کر سکتا کہ حضرتؒ کو تحریکِ احرار سے گہری دلچسپی اور اس کے رہنماؤں اور کارکنوں سے عزیزانہ سرپرستانہ محبت و شفقت تھی۔ اور وہ بھی حضرتؒ کو اپنا روحانی سرپرست اور پشت پناہ سمجھتے تھے۔

> حضرتؒ اپنی خداداد سیاسی بصیرت سے احرار کے لیے یہی مناسب سمجھتے تھے کہ وہ وقتی اور مقامی تحریکوں اور اندھے جوش سے اپنے کو بچا کر اپنی جدوجہد جاری رکھیں اور نافہم عوام کے جذبات و مطالبوں سے بے پرواہ ہو کر خلوص اور ہوشیاری کے ساتھ اپنا کام کرتے رہیں۔ اور صرف ملک کی آزادی مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کی بہتری اور دشمن اسلام تحریکوں اور سازشوں (جن میں قادیانیت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے) کا مقابلہ کرنا پیشِ نظر رکھیں۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر حضرتؒ احرار کی مسجد شہید گنج ایجی ٹیشن میں شرکت (جو حضرت کے نزدیک احرار کو الجھانے کے لیے شروع کیا گیا تھا) مناسب اور قرینِ خیال نہیں سمجھتے تھے۔ حضرتؒ کے اس رجحان اور جماعت احرار سے تعلق کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا۔ جو مولانا محمد علی جالندھری نے بیان کیا مولانا لکھتے ہیں: ''پنجاب میں مجلس احرار مقبول ترین جماعت تھی۔ جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے ۱۹۳۶ء کے انتخابات سر پر تھے۔ اولاً حکومت پنجاب نے احرار لیڈروں سے سودا کرنا چاہا کہ انتخابات میں تم آگے آؤ ہم تعاون کریں گے۔ آنے والی جنگ میں مجلس احرار نے برطانیہ کی امداد کرنے سے انکار کر دیا۔ جب تک مکمل آزادی کا اعلان نہ کر دیا جائے۔ گورنر پنجاب نے شہید گنج مسجد گرا کر حالات تبدیل کر دیے۔ مجلس احرار پر انتہائی امتحان کا وقت آیا۔ مسلمان انتہائی مشتعل تھے اور ایجی ٹیشن کرنا چاہتے تھے مگر یہ راستہ غلط تھا۔ حکومت کے خرید کردہ لیڈروں نے مسلمانوں کو پاگل بنا دیا تھا۔ احرار بزرگوں نے مسلمان قوم کو راستہ سے روک کر اپنی بے پناہ مقبولیت قربان کرنی گوارہ کی لیکن غلط رہنمائی کر کے اپنا باقی رکھنا منظور نہ کیا۔ پوری مسلمان قوم ناراض ہوگئی۔ گورنر کا منشا پورا ہوا۔ یہ سب کچھ ہونے کے بعد احرار کے بزرگ اتفاقاً حضرتؒ سے کسی جگہ مشرف بزیارت ہوئے۔ بار بار ہنس کر فرمایا کہ میں تو سمجھا تھا کہ ''کووے میرے شیر کووے'' یعنی میرے شیر ایجی ٹیشن کریں گے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے رہنمائی فرما دی۔''

(مکتوب مولانا محمد علی جالندھری بنام مؤلف)

امیر شریعت اور اُن کی اولاد سے محبت:

حضرت رائے پوری رحمتہ اللہ علیہ کو فقط امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ سے ہی محبت نہیں تھی بلکہ آپ امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد سے بھی والہانہ محبت کا اظہار اور اُن کے لیے خصوصی دعائیں فرماتے۔ میں اپنے آپ کو انتہائی خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ میں نے امیر شریعتؒ کے علاوہ ان کے بیٹوں کے ساتھ بھی اپنی زندگی کا بڑا حصہ بسر کیا ہے۔ بعض لوگ شکوۃً یہ کہہ دیتے ہیں کہ امیر شریعت کے بیٹوں کے مزاج میں وہ کشش اور جاذبیت نہیں جو کہ امیر شریعت کی شخصیت کا ایک مرکزی جوہر کمال تھا۔ اس کے جواب میں خود بیٹے کہتے ہیں کہ ہمیں امیر شریعت سے نسبت تو ہے لیکن ہم امیر شریعت نہیں۔ نہ ہی ہم امیر شریعت بن سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے میرا بھی یہی سوال ہے کہ اگر امیر شریعت کے بیٹوں میں بھی وہ تمام خصوصیات خصوصاً مزاج کے حوالے سے جو بات کہی جاتی ہے، ہوتیں تو پھر امیر شریعت اور اُن کے بیٹوں کے درمیان کیا فرق رہ جاتا۔ ایسے میں تو امیر شریعت کی ذات کی وہ کشش جس کا تذکرہ زبانِ زد خاص وعام ہے، اُس کی توہین ہو جاتی۔ بنیادی سوال تو یہ ہے کہ کیا امیر شریعت کے بیٹوں نے امیر شریعت کے نقشِ قدم پر اپنا قدم نہیں رکھا۔ کیا امیر شریعت کے بیٹوں نے دین کی راہ کو چھوڑ کر دنیا کی راہ اختیار کر لی ہے۔ کیا دین کے لیے جو خلوص اور جو محنت امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ نے کی تھی، اُس خلوص اور اُس ایثار کی جھلک اُن کے بیٹوں میں موجود نہیں ہے۔ جس نصب العین کے لیے امیر شریعت نے اپنی پوری زندگی داؤ پر لگا دی تھی کیا وہ نصب العین اُن کے بیٹوں کی نظر سے اوجھل ہو گیا۔ دین کے احیاء اور بقاء کے لیے جو کچھ امیر شریعت نے کیا، کیا اُن کے بیٹوں نے اس سے منہ موڑ کر اپنے لیے دنیاوی عیش وعشرت کے سامان اپنے گرد وپیش اکٹھے کر لیے؟ اگر ایسا نہیں جیسا کہ ہرگز نہیں تو پھر یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ امیر شریعت کے بیٹوں پر بھی اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اُسی طرح ہے جس طرح خود امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ پر تھا۔ وہی سادگی، وہی جذبہ، وہی عزم، وہی استحکام، وہی بہادری، وہی جوش، وہی ولولہ، وہی خودداری، وہی سادگی، وہی محنت، وہی خلوص، وہی ایثار جو ہم امیر شریعت کی زندگی میں دیکھتے ہیں اُن کے بیٹوں میں بھی موجود ہے۔ اس لیے امیر شریعت کی طرح اُن کے بیٹے بھی ہر سلیم الفطرت مسلمان کے لیے انتہائی قابل احترام ہیں اور اس سلسلے میں آخری بات یہی ہے کہ امیر شریعت کی طرح امیر شریعت کے بیٹوں پر بھی حضرت رائے پوری کی نگاہِ کرم تھی اور یہ اُن کی دعاؤں کا صدقہ ہے کہ دین کے کام میں امیر شریعت کی اولاد میں کہیں جھول ہمیں نظر نہیں آتی۔ وہ ہمہ وقت دین کے لیے کمر بستہ نظر آئے۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ جس میں حضرت رائے پوریؒ نے امیر شریعتؒ کے بیٹوں کے بارے میں کیا کچھ نہیں کہہ دیا:

''مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی سے جو قلبی تعلق تھا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ان حضرات کے جیل جانے کے بعد ان کے خاندان اور پسماندہ افراد کی فکر رکھتے اور ان سب کی ذمہ داری محسوس فرماتے۔'' مولانا محمد علی جالندھریؒ لکھتے ہیں:

> ''مولانا حبیب الرحمٰن منٹگمری جیل میں نظر بند تھے۔ ملاقات کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ میں رائے پور حاضر ہوا۔ فرمایا کہ مولانا حبیب الرحمٰن سے ملاقات اگر کسی طرح ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔ دل ملاقات کو چاہتا ہے۔ میں نے عرض کیا: حضرت میں انتظام کروں گا۔ اس پر بہت ہی خوشی کا اظہار فرمایا۔ فرمایا: ضرور کوئی انتظام کریں۔ سخت سردی کا موسم تھا۔ میں نے ایک ایم۔ ایل۔ اے کے ذریعے جو میرا ملاقاتی تھا، وزیر جیل منوہر لال سے اجازت لی۔ بذریعہ تار ملتان میں اجازت کی اطلاع ملی۔ میں نے رائے پور اطلاع دی۔ حضرت والا سخت سردی میں منٹگمری تشریف لائے۔ میں سٹیشن پر پہلے ہی سے موجود تھا۔ ایک دوست کے ہاں قیام کیا۔ صبح مولانا حبیب الرحمٰن سے ملاقات ہوئی۔ امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے متعلق بڑے بلند کلمات فرماتے تھے۔ اور ان سے ان کی وجہ سے ان کے خاندان سے بڑی محبت وشفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ تم بخاری کو یوں نہ سمجھو کہ صرف لیڈر رہی ہیں۔ انھوں نے ابتداء میں بہت ذکر کیا ہے اور فرمایا کہ یقین تو اللہ تعالیٰ نے ایسا نصیب فرمایا ہے کہ باید وشاید۔ میاں حالات وکیفیات کیا چیز ہے۔ اصل تو یقین ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کو عطا فرما دے۔ مولانا محمد علی جالندھری فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت کے سامنے بخاری صاحب کے لڑکوں کا تذکرہ آیا۔ فرمایا کہ شاہ صاحب کے لڑکے ہیں۔ میں تو ان کا نوکر ہوں۔ یہ محبت اور خصوصیت ان کے اخلاص، خود فراموشی، دینی خدمت میں انہماک؟ جو ان کی ذات اور ان کی ایمان افروز تقریروں عظیم مجموعوں میں پہنچتا تھا اور خصوصیت کے ساتھ پنجاب اور بالخصوص ملتان اور اُس کے نواح میں جو عقائد کی اصلاح ہوئی تھی۔ خود شاہ صاحب اپنی تقریروں اور کوششوں کی روح اور اپنی زبان کے اثر اور اس محنت وجفاکشی کے تحمل کا راز ایک مخلص اور مقبول بندہ کے ساتھ تعلق اور اُس کی دعاؤں اور محبت کو سمجھتے تھے اور اس پر ان کو بڑا ناز اور بہت اعتماد تھا۔ احرار سے محبت کی وجہ ان کی شانِ قلندرانہ اور جرأتِ رندانہ تھی۔ ہر نئے فتنے اور جدید فرقہ کے مقابلے میں یہ سینہ سپر اور سربکف ہوتے۔ قادیانیت، رفض وتفضیل اور متعدد ایسی گمراہ کن تحریکیں تھیں جن کے مقابلہ میں یہی سرپھرے میدان میں آتے۔
>
> ''کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے''
>
> (سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری، علی میاں، صفحہ ۹۳، ۲۹۲)

رِقت وشوق کا غلبہ:

حضرت رائے پوری علیہ الرحمتہ پر رقت وشوق کا غلبہ تھا خصوصاً جس وقت آپ بزرگان دین کے واقعات سنتے یا پھر کوئی آپ کے سامنے شوقیہ یا پھر عشقیہ شعر پڑھتا

اکثر اوقات فرمائش کرتے کہ اچھا کلام سناؤ۔ کسی اچھے قاری سے حضرت رائے پوری علیہ الرحمتہ پر رقت وشوق کا غلبہ تھا خصوصاً جس وقت آپ بزرگان دین کے واقعات سنتے یا پھر کوئی آپ کے سامنے شوقیہ یا پھر عشقیہ شعر پڑھتا اکثر اوقات فرمائش کرتے کہ اچھا کلام سناؤ۔ کسی اچھے قاری سے قرآن سننے کا بھی آپ کو از حد شوق تھا اور جب قاری تلاوتِ قرآن پاک کرتا تو آپ پر عجیب وغریب کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو چھلک چھلک جاتے۔ علی میاں اپنی کتاب سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کے صفحہ ۲۱۵ پر تحریر کرتے ہیں:

''ایک رات تہجد کے وقت دو بجے آپ بیدار ہوئے، چارپائی صحن سے برآمدہ میں لے جاتے تھے۔ قاری حسن شاہ صاحب بھی چارپائی کو اٹھائے ہوئے تھے۔ کسی نے ان کا ویسے ہی نام لیا۔ حضرت نے فرمایا یہ اس وقت کچھ سناتے نہیں۔ قاری صاحب نے پوری محبت اور اخلاص سے قرآن پاک کا ایک رکوع سنایا۔ حضرت پر رقت طاری ہوئی، تمام خانقاہ تلاوتِ کلام سے گونج رہی تھی۔

ایک دن عصر کے وقت قاری عطاء المہیمن بخاری ابن عطاء اللہ شاہ بخاری سے ایک رکوع قرآن پاک کا سماعت فرمایا تو آپ پر کیفیت گریہ کی بہت ہوئی غالباً کچھ حضرت شاہ صاحب کی یاد بھی آئی جس سے کیفیت میں اضافہ ہوا۔''

اسلام اور مسلمانوں کے لیے فکرمندی:

حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کو اسلام اور مسلمانوں کی حالتِ زار کا بڑی شدت کے ساتھ احساس تھا جس کا تذکرہ وہ اکثر اپنی مجلس میں بھی کرتے تھے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ فکرمندی ان کے نظامِ زندگی کی روح رواں بن گئی تھی تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ یہ فکرمندی کبھی تو درد بن کر آہ فغاں میں تبدیل ہو جاتی اور کبھی تنہائیوں میں آپ کی آنکھوں سے آنسو بن کے جھلک جھلک جاتی۔ خصوصیت کے ساتھ ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے وقت فسادات کی صورت جو کچھ ہوا اس پر آپ انتہائی بے قرار اور مضطرب رہتے تھے اور کہتے تھے کہ جس سرزمین کو ہمارے صوفیاء کرام نے اپنے خون سینچا تھا۔ اسے ہمارے مسلمان چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ہیں اور کہتے کہ اس ساری صورت حال میں مجھے تو اسلام اور مسلمانوں کا زوال نظر آ رہا ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے اپنے کسی خادم سے یہ فرمایا کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں تنہائی میں عبادت میں مصروف رہتا ہوں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات پورا وقت مسلمانوں کے فکر ورنج اور قلق میں گزر جاتا ہے۔

سیاسی مسلک:

حضرت رائے پوری کے سیاسی مسلک میں جذبۂ dhj اور دشمنی بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے پیر ومرشد شاہ عبدالرحیم رائے پوری اور شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہما اللہ کو اپنا پیشوا تسلیم کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا تعلق اور آپ کا رابطہ انھیں جماعتوں کے ساتھ رہا جو ملک کی آزادی کے لیے کافروں کے خلاف برسرِ پیکار رہیں۔ آپ کے سیاسی مسلک کے مطابق ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے بقا اور ارتقاء کا راز اس میں مضمر تھا کہ مسلمان ہندوستان کے صوفیاء کرام (جن میں خاص طور پر خواجہ معین الدین اجمیری کا نام زیادہ نمایاں ہے) کی تقلید میں ہندوستان کی قدیم آبادی کے ساتھ محبت اور اخلاقی طاقت سے ان کے دل جیت لینے کی کوشش کو اپنا مقصدِ حیات بنالیں اور یہ بات اسی وقت ہی ممکن تھی جب ہندوستان تقسیم نہ ہو بلکہ متحد رہے۔ آپ کے نزدیک ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے مقبولیت کا وہی راستہ درست راستہ تھا جو ساتویں صدی کے اندر صوفیاء کرام نے اختیار کیا اور اپنی روحانی اور اخلاقی طاقت کے ذریعے لاکھوں غیر مسلم کو دائرۂ اسلام میں لے آنے میں کامیاب ہوئے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ ہر اس بات کے خلاف تھے جو ہندوستان میں ہندو مسلم اختلاف کو ہوا دینے کا باعث بنے۔ شاید اسی لیے آپ کے دل میں مولانا حسین احمد مدنی کی محبت، عشق کی حد تک موجود تھی وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے بھی دل وجان سے قائل تھے اور تقسیم ہند کو مسلمانوں کے لیے مضر اور دین اسلام کی اشاعت اور ترقی کے لیے نقصان دہ خیال کرتے تھے۔ آپ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری دونوں کے پیر ومرشد تھے اور ان کے لیے خصوصی توجہ اس لیے تھی کہ وہ مجلس احرار اسلام کی قیادت کر رہے تے جو ہندوستان کے اندر انگریز دشمنی کا استعارہ بن چکی تھی۔ تقسیم ہند کے بعد ایک مرتبہ آپ نے لاہور میں ایک مجلس میں تقسیم ہند پر تبصرہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''ہمیں تو پہلے ہی معلوم تھا کہ تقسیم مسلمانوں کے لیے سراسر مضر ہے میرا تو یہ ملک دیکھا ہوا ہے جس کا تمام نقشہ میرے ذہن میں موجود تھا ہمارے قائد بے چارے صرف جغرافیائی حیثیت سے ہی کچھ معلومات رکھتے تھے، ملک کا دورہ نہیں کیا تھا، ان کو کیا معلوم کہ تقسیم کس طرح صحیح ہوگی، نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ جب دو بھائی مشترکہ چیز کو آپس میں تقسیم کرتے ہیں تو ہر ایک کو دوسرے کے ساتھ نزاع ہی رہتا ہے کہ ہماری یہ چیز وہ لے گیا اور دوسرا سمجھتا ہے کہ یہ ہماری چیز وہ لے گیا۔ چنانچہ اب کشمیر کے متعلق بھی یہی نزاع ہو رہا ہے۔''

یہ بات لاہور میں ۸/جنوری ۱۹۵۸ء کی ہے اسی دور میں آپ نے ایک دوسری مجلس میں یوں ارشاد فرمایا:

''انگریز، مسلمانوں کے سخت دشمن ہیں۔ انھوں نے قصداً تقسیم میں مسلمانوں کو نقصان پہنچایا لیکن ہمارے مسلمان ایسے سیدھے ہیں کہ اسی انگریز سے جو دشمن ہے تقسیم کرائی۔''

عجز وانکساری:

حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں جو لوگ ان کے قریب رہے ہیں یہی بیان کرتے ہیں کہ وہ عجز وانکساری اور بے نفسی وبے غرضی کے میدان میں بھی

اپنی مثال آپ تھے۔ ''میں'' نام کی کوئی چیز ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھی۔ وہ اپنے پیرومرشد حضرت عبدالرحیم کی طرح اس میدان میں ان کے نقش قدم پہ تھے۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ انھیں اپنے روحانی مقام ومرتبہ کا احساس تک نہ تھا۔ مجلس کے اندر آپ نے کبھی کوئی ایسی بات کبھی نہیں فرمائی تھی جس کے سننے کے بعد لوگوں کے دلوں میں ان کی عقیدت میں اضافہ ہو، ہر بات اور ہر معاملے میں آپ اپنی نفی اور اپنی انکساری کا ہی اظہار فرماتے تھے۔ اس سلسلے میں چند اہم واقعات کا ذکر علی میاں نے اپنی کتاب سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمتہ اللہ علیہ میں کیا ہے جو نذرِ قارئین ہیں:

(۱) ''راولپنڈی میں ایک مرتبہ قریشی صاحب کی کوٹھی پر چمن میں عصر کے بعد بڑی وسیع مجلس تھی۔ بعض اعلیٰ عہدے دار، ممتاز علماء اور عمائدِ شہر جمع تھے۔ پروفیسر عبدالمغنی صاحب جے پوری نے (غالباً اس خیال سے کہ حضرت کچھ ارشاد فرمائیں اور لوگ مستفید ہوں) سوال کیا کہ حضرت صبر کی حقیقت کیا ہے۔ حضرت نے بڑی بے تکلفی سے راقم کی طرف اشارہ کیا کہ مجھے تو معلوم نہیں، ان سے پوچھو۔ میں نے اپنے نزدیک بڑی کسرِ نفسی اور تواضع سے کام لیتے ہوئے عرض کیا کہ حضرت مجھے تو اس کے لغوی معنی کے سوا کچھ معلوم نہیں۔ مجلس پر سناٹا چھا گیا۔ حضرت کو اس کا احساس نہیں معلوم ہوتا تھا کہ مجلس کے خواص حضرت کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔ جن کو علماء وعمائد کے ایک بڑے گروہ نے اپنا شیخ ومربی تسلیم کر رکھا ہے۔''

(۲) ''ایک مرتبہ لائل پور کے دوران قیام میں اس بارے میں خدام اور احباب کے درمیان بڑی کشاکش تھی کہ حضرت رمضان کہاں کریں۔ لائل پور کے اہل تعلق لائل پور کے لیے کو شاں تھے۔ لاہور کے احباب لاہور کے لیے مُصر تھے اور قریشی صاحب راولپنڈی کے لیے عرض کرتے تھے۔ حضرت نے ایک روز سحر کے وقت تینوں گروہوں کے خاص خاص اشخاص کو بلوایا اور فرمایا: بھائی دیکھو میں ایک غریب کاشتکار کا بیٹا ہوں۔ میرے گھر میں ایسی غربت تھی کہ میں جب طالب علمی میں آیا کرتا تھا تو میری والدہ کو فکر ہوتی تھی کہ گیہوں کی روٹی کا انتظام کس طرح کریں، غبی بھی ہوں اوّل تو کچھ زیادہ پڑھا نہیں، پھر جو کچھ پڑھا تھا وہ بھی بھول گیا۔ اب جو تم مجھ کو کھینچے کھینچے پھرتے ہو اور کوئی ادھر لے جانا چاہتا ہے کوئی ادھر۔ تو یہ محض اس کی برکت ہے کہ کچھ روز اللہ کا نام لیا۔ تم خود اخلاص کے ساتھ چند روز اللہ کا نام کیوں نہیں لیتے کہ خود مطلوب بن جاؤ۔ یہ تقریر کچھ ایسی سادگی اور اثر کے ساتھ فرمائی کہ بعض حضرات کی آنکھوں سے آنسو آ گئے۔''

(۳) ''لکھنو سے بریلی جاتے ہوئے سفر میں مجھ سے فرمایا کہ آپ لوگ اہل علم ہیں۔ آخر آپ نے مجھے کیوں آگے کر دیا اور کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔''

(۴) ''ایک مرتبہ آزاد صاحب نے حضرت کو مخاطب کر کے ایک غزل کہی جس کا مقطع تھا

یہ کیا ستم ہے کہ آزاد تیرے ہوتے ہوئے
ہے میکدہ میں بھی اور تشنہ کام ہے ساقی

یہ شعر سن کر فرمایا۔ کہ بھائی میرے پاس تو پانی بھی نہیں۔ شعر تو شیخ الحدیث کو سنانا۔ یہ دراصل حضرت کا حال تھا۔ جس میں کسی تصنع یا مصلحت بینی کا دخل نہیں تھا۔ بداہتہً اور وجدانی طور پر اپنے کو کمال سے عاری سمجھتے تھے اور اہل نظر کے نزدیک یہ مقام ہزار کرامتوں اور ہزار علوم ومعارف سے ارفع ہے۔''

(۵) ''بے نفسی اور فنائیت کا ایک اور واقعہ جو میرے نزدیک سینکڑوں مجاہدات وصدہا کرامات سے بھی بلند اور بیش قیمت ہے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوگا کہ حضرت کی طبیعت وقتی تاثرات وجذبات سے کس قدر غیر متاثر واقع ہوئی تھی۔ اور آپ کا مزکی النفس بے نفسی کی اور فنائیت کے کس درجہ پر پہنچ گیا تھا۔ آپ کی طبیعت کس درجہ وضع داری، نباہ کی قوت اور حق شناسی تھی۔

وفات سے تین چار ماہ قبل کا واقعہ ہے کہ حضرت رحمتہ اللہ علیہ کے وہ خادم جو ساری عمر خانقاہ کے کھانے وغیرہ کے ذمہ دار تھے اور بوجہ اپنی علالت کے، ان کی بیوی نے اپنے لڑکے کے ذریعے معذوری ظاہر کر دی جس پر حضرت کے کچھ فرمائے بغیر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے اپنے گھر میں کھانے کا انتظام کیا۔ حضرت نے بالکل سکوت فرمایا۔ اس کے بعد منتظمین نے ان کے خلاف بہت شکایات کیں۔ کھانا اچھا نہیں ہوتا تھا۔ روٹی کچی ہوتی تھی۔ کبھی نمک غائب، مہمانوں کو تکلیف ہوتی تھی۔ غرض کہ اس طرح کی بہت سی باتیں انھوں نے کیں کہ بہت اچھا ہوا انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔ حضرت سے انھوں نے کہا کہ یہ منجانب اللہ ہوا ہے۔ ہم چاہتے بھی یہی تھے۔ لیکن ان سب کے کان بھرنے کے باوجود حضرت نے سکوت اختیار کیا۔ کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ صرف ایک مرتبہ ان شکایات کے جواب میں ایک عام بات فرمائی، کہ بھائی اصل میں ایک کام جب بہت دن تک کیا جاتا ہے تو اس میں اتنا اہتمام نہیں رہتا اور ایسی باتیں ہو ہی جاتی ہیں۔

بہرحال دوسرے ان حضرات نے ان کو دوسری کوٹھی سے بلوایا۔ مگر وہ آئے نہیں۔ کئی گھنٹے کے بعد پھر بلوایا پھر بھی نہیں تشریف لائے۔ ظہر کے بعد پھر وہ شکایات کا سلسلہ جاری ہوا۔ اس کے بعد حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے فوراً آدمی بھیجا۔ اب کی وہ تھوڑی دیر کے بعد آ گئے۔ کمرہ خالی کرایا گیا۔ چارپائی کی پشت پر حضرت کے بھائی مولانا عبدالوحید تشریف رکھتے تھے۔ حضرت استغراق میں تھے۔ جب وہ آئے تو حضرت نے فرمایا: کون ہے؟ انھوں نے کہا ظفرالدین۔ فرمایا: آ گئے؟۔ تمہارا کیا حال ہے۔ انھوں نے اپنا حال بتلایا اور ڈاکٹر کے دکھانے کا ذکر کیا۔

حضرت نے فرمایا مجھے تمہاری بیماری کی بڑی فکر ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں صحت عطا فرمائے۔ میں بہت معذور ہوں، چل نہیں سکتا۔ ورنہ دن میں کئی مرتبہ تمہاری خدمت میں آتا۔ اگر تکلیف کی وجہ سے نہیں آ سکتے ہو تو اپنے لڑکے بشیر احمد کے ذریعے اپنی خیریت کہلوا دیا کرو۔ دوا بھی تو تم نے خریدی ہوگی؟ جب ڈاکٹر کے پاس گئے تو کچھ پیسے تو لے جاتے۔ انھوں نے جواب دیا کہ حضرت دس روپے لے گیا تھا اور دوا اتنے میں ہی آئی۔ اس کے بعد حضرت نے ارشاد فرمایا کہ میری واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالو (اس میں اُس وقت ۴۰۳ روپے تھے) اور فرمایا یہ رکھ لو۔ دوائی وغیرہ میں کام آئیں گے۔ اس کے بعد فرمایا دوسری جیب میں بھی تو دیکھو اس میں بہت بڑی رقم تھی۔ فرمایا: یہ بھی رکھ لو۔ انھوں نے کچھ تکلف کیا۔ حضرت نے فرمایا اور بھی بہت سے خرچ ہیں اس کو رکھ لو اللہ کا شکر کرو۔ یہ محض میرے مالک کا فضل ہے۔ جب وہ رقم لے کر واپس جانے لگے تو حضرت نے پھر آواز دی اور ارشاد فرمایا تم نے ہمارا کھانا پکانا کیوں چھوڑ دیا ہے؟ تین چار مہینے کی بات تھی۔ میں تو

چاہتا تھا کہ تمہارے ہی ہاتھ سے کھاتے۔انھوں نے اپنی اور اپنی اہلیہ کی بیماری کا ذکر کیا۔حضرت نے فرمایا تمہاری تین بچیاں ہیں۔انھوں نے عرض کیا وہ چھوٹی بچیاں ہیں۔حضرت نے فرمایا ہم تو چاہتے ہیں کہ تمہارے ہی ہاں کھائیں، چاہے جیسا بھی ہو کچا ہو یا پکا ہو، بے نمک ہو جس طرح کا بھی ہو، اگر تم اور تمہارے گھر والے نہ کر سکیں تو ایک ملازمہ رکھ لو، خرچہ ان شاء اللہ میں دے دوں گا۔اس کو مجھ سے لے لیا کرو کسی کو خبر نہ لیکن پکے تمہاری ہی نگرانی میں۔انھوں نے کہا کہ کام کرنے والی کوئی عورت اچھی نہیں ملتی۔حضرت نے فرمایا تمہیں اچھی نہیں ملتی تو بھائی فضل الرحمٰن سے ہی کہتا ہوں، وہ انتظام کر دیں گے۔انھوں نے کہا کہ سوچ کر بتا دوں گا۔اسی درمیان یہ بھی فرمایا: تمہارے پاس چاول کی بوریاں بھی تو آئی تھیں۔ان میں سے ایک بوری چاول علی میاں کے لیے ہمیں چاہیے۔اس کے بعد وہ چلے گئے اس کے بعد حضرت نے کچھ نہیں کہا۔

دوسرے تیسرے روز بہت بڑی تعداد میں ہدایا و تحائف اور رقمیں آئیں۔حضرت کی جیبیں تو روپے سے بھر ہی چکی تھیں پوری چارپائی بھی نوٹوں سے اٹ گئی۔اپنے بڑے رومال میں ان سب روپوں کو اکٹھا کر کے باندھ لیا۔اس کے بعد حاجی ظفر الدین صاحب کو بلوایا اور ان سے فرمایا کہ ان کو خوب مضبوطی اور کس کے باندھ لو تاکہ زیادہ بڑی نہ معلوم ہو اور لے جاؤ۔کھانے کے سلسلے میں کوئی بات نہیں فرمائی۔'' (صفحہ ۲۴۷ تا ۲۵۱، روایت: مولانا عبدالوحید)

ردّ قادیانیت کی تین اہم شخصیتیں:

تاریخ محاسبۂ قادیانیت میں کئی نامور شخصیتوں کا تذکرہ ملتا ہے۔جنھوں نے مذہب کے نام پر قادیانیت کے اس سیاسی گروہ کے اصل خدوخال کو امت مسلمہ سے متعارف کرایا اور قادیانیت کی یلغار کو روکنے کے لیے انتہائی اہم خدمات سرانجام دیں۔جو تاریخ پاک و ہند کی اسلامی تاریخ کا ایک روشن باب ہے اور جس پر ہماری آنے والی نسلیں قیامت تک فخر کرتی رہیں گی۔لیکن تین شخصیتیں اپنی نوعیت کار کے حوالے سے باقی تمام شخصیتوں سے مختلف و منفرد شخصیتیں ہیں۔جن میں مولانا محمد علی مونگریؒ، مولانا انور شاہ کاشمیریؒ اور مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ شامل ہیں۔قادیانیت کے سیلاب کو روکنے اور امتِ مسلمہ کو قادیانیت کے خلاف تلقین و ترغیب کے میدان میں ان تینوں شخصیتوں کا اپنا مقام و مرتبہ ہے۔جو بے چینی و اضطراب اس سلسلے میں ان کے ہاں ملتی ہے وہ ہمیں کہیں دوسری جگہ نظر نہیں آتی۔مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کے بارے میں آپ چار قسطوں میں میرا مضمون پڑھ چکے ہیں اور حضرت رائے پوریؒ کے بارے میں آخری قسط میں آپ پڑھ لیں گے کہ آپ قادیانیت کے بارے میں کس قدر بے چین و مضطرب رہتے تھے۔شاید اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ قادیانیت کو امت مسلمہ کے مدِ مقابل ایک ایسی سامراجی تنظیم سمجھتے تھے کہ جس کا وجود امتِ مسلمہ کے دینی عقائد کے ساتھ ساتھ سیاسی مقاصد کے حصول کے راستے کی بھی ایک اہم رکاوٹ تھی۔لیکن یہاں تھوڑا سا تذکرہ مولانا محمد علی مونگریؒ کے بارے میں ضروری سمجھتا ہوں۔مفصل مضمون تو پھر کسی وقت انشاء اللہ تحریر کرنے کا ارادہ ہے تاہم اک تسلسل کو قائم کرنے کے لیے چند سطریں ان کے بارے میں ضروری خیال کرتا ہوں۔

مولانا محمد علی مونگریؒ ردِّ قادیانیت کے محاذ پر اپنی پیرانہ سالی اور علالت کے باوجود اس قدر مستعد ہو گئے تھے کہ رات دن انہیں بس ایک ہی فکر دامن گیر رہتی تھی کہ قادیانیت کا محاسبہ اور اس کا تدارک کس طرح ممکن ہو۔مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی سے تعلق رکھنے والے ہزاروں نہیں لاکھوں لوگ بالخصوص ایسے تمام لوگ جن کا صوبہ بہار سے تعلق تھا مولانا کے ساتھ روحانی طور پر وابستہ تھے۔جس کی وجہ سے آپ کو معاونین کی ایک کثیر تعداد میسر آ گئی تھی جنھیں انھوں نے قادیانیت کے خلاف کام کرنے کی ترغیب دلائی اور اس طرح بہت جلد یہ ترغیب ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔بعض تجزیہ نگاروں کے مطابق تاریخ محاسبۂ قادیانیت کے سلسلے حضرت مولانا محمد علی مونگریؒ کو روزِ اوّل میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔وہی جذبہ، وہی ذوق و شوق، وہی بے چینی و اضطراب جو ہم حضرت انور شاہ کاشمیری اور حضرت رائے پوری میں دیکھتے ہیں مولانا محمد علی مونگری کے ہاں بھی موجود ہے۔انھوں نے صوبہ بہار میں خصوصیت کے ساتھ قادیانیت کی یلغار کو نہ صرف روکا بلکہ اسے پسپائی پر مجبور کر دیا۔

حضرت رائے پوری اور قادیانیت:

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کو ایک فوقیت دوسرے اکابر پہ اس طرح حاصل تھی کہ انھوں نے قادیانیت کے دورِ آغاز اور اس کے دوسرے تمام ادوار کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور خود مرزا غلام احمد قادیانی اور حکیم نورالدین سے ذاتی و قریبی واقفیت حاصل کی۔شاید یہی سبب تھا کہ آپ پر قادیانیت کے در پردہ مقاصد بڑی تفصیل کے ساتھ واضح ہو گئے۔انھیں اس بات کا شدید احساس ہو گیا تھا کہ قادیانیت دینِ اسلام کے بنیادی عقائد اور سیاسی مقاصد کے راستے کی ایک عظیم رکاوٹ ہے اور اگر اس فتنہ کا تدارک نہ کیا گیا تو یہ فتنہ آگے چل کے مسلمانوں کے لیے نہ صرف پاک و ہند بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی اتنی مہلک اور خطرناک صورت اختیار کر لے گا کہ اسکا علاج سرے سے ممکن ہی نہی ہوگا۔حضرت رائے پوریؒ قادیانیت کو ہر حوالے اور ہر سطح پر اسلام کی بیخ کنی اور تخریب کاری کا ذریعہ سمجھتے تھے۔اس کے ساتھ ساتھ آپ کو جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عقیدت اور ان پر جو اعتماد تھا، آپ کی ذاتِ اقدس کے ساتھ جو آپ کو عشق اور محبت تھی اس کی بنا پر بھی وہ ہر مدعیٔ نبوت کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا رقیب و حریف ہی نہیں بلکہ دشمن سمجھتے تھے۔اس صورت حال نے ہی تو آپ کو بے حال و بے چین کر دیا تھا۔ہر وقت انہیں یہی احساس دامن گیر رہتا کہ قادیانیت کا راستہ روکنے کے لیے کیا کیا ذرائع استعمال میں لائے جائیں کہ یہ سیلاب کفر و الحاد ایک حد تک محدود ہو کے رہ جائے اور حد سے آگے نہ بڑھ سکے۔وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک غیرت مند عاشق اور ایک وفادار غلام تھے اور ان کے عشق اور ان کی غلامی کا ہی تقاضا تھا کہ وہ ہر ممکن وسیلہ اختیار کر کے قادیانیت کے زہر کے لیے کوئی تریاق تلاش کرنے میں ہمہ تن مصروف رہتے۔چنانچہ ان کے ہاں بھی اس سلسلے میں وہی بے چینی اور وہی اضطراب نظر آتا ہے جو مولانا محمد علی مونگری بانی ندوۃ العلماء اور حضرت انور شاہ کاشمیری کے ہاں ردِ قادیانیت کے سلسلے میں ہم

دیکھتے ہیں۔مجلس احرار اسلام کے ساتھ جو حضرت رائے پوری نے تعلق اور واسطہ اختیار کر رکھا تھا۔اس کی غرض وغایت بھی یہی تھی کہ وہ بے چینی اور وہ اضطراب جوان کے اپنے ہاں قادیانیت کے سلسلے میں تھا۔اسے مجلس احرار میں منتقل کر دیا جائے اور اس طرح یہ جنگ جو انفرادی سطح پر جاری ہے اسے جماعتی سطح پر تبدیل کر دیا جائے۔وہ یہ بات سمجھتے تھے کہ جماعت کا مقابلہ صرف جماعت ہی کر سکتی ہے۔اور تنظیم کا مقابلہ صرف تنظیم ہی کی صورت میں کیا جا سکتا ہے۔یہ ان کے خلوص ان کے اضطراب اور بے چینی کے صدق کی ایک مبین دلیل ہے کہ حضرت رائے پوریؒ کی وہ بے چینی واضطراب جو انہیں قادیانیت کے بارے میں تھی۔اسے مجلس احرار اسلام کے رہنماؤں میں منتقل کرنے میں وہ سو فیصد کامیاب ہوئے۔احرار رہنماؤں میں دراصل ان کے ہی جذبے کی کارفرمائی تھی۔آپ کہہ سکتے ہیں کہ مجلس احرار اسلام کے رہنما میں لے کر اس کے ہر رضا کار تک حضرت رائے پوریؒ کا ہی عطا کردہ جذبہ کام کر رہا ہے جواب تک قادیانیت کے محاسبے کے لیے سرگرم کار ہے اس لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو ہماری نظروں میں حضرت رائے پوریؒ کا مقام ومرتبہ بلند ہو جاتا ہے کہ انھوں نے مجلس احرار اسلام ہی کو اس قابل جانا جماعت پر شفقت فرماتے۔احرار کو دل وجان سے چاہتے اور ہر محاذ اور ہر کام میں جو رد قادیانیت کے سلسلے میں مجلس احرار سر انجام دیتی اس کی آپ سرپرستی فرماتے تھے اور مجلس احرار اسلام کو توانا اور مضبوط سے مضبوط تر بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش بھی کرتے تاکہ مجلس احرار اسلام زیادہ مضبوط اور مؤثر انداز میں قادیانیت کا محاسبہ کر سکے۔مرزائیت کے بارے میں ہمہ وقت متفکر رہنا ان کی مقتضائے طبیعت بن گئی تھی جب بھی کوئی مجلس احرار اسلام سے متعلقہ رضا کار یا پھر رہنما آپ کے پاس آجاتا تو آپ سب کو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو جائے اس سے پوچھتے کہ قادیانیت کے بارے میں ملک کے اندر کیا ہو رہا ہے اگر کوئی احرار سے متعلقہ رہنما آتا تو اسے تحفظ ختم نبوت کے مشن کے لیے مالی امداد بھی مہیا کرتے اور تمام متعلقین جو اس وقت آپ کے پاس بیٹھے ہوئے ہوتے انھیں بھی متوجہ کرتے۔مولانا محمد علی تحریر فرماتے ہیں۔

''ایک دفعہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو ایک نوٹ نکال کر عطا فرمایا کہ ختم نبوت کی امداد میری طرف سے حاضرین کو توجہ دلائی،سب نے امداد کی مولانا فضل احمد نے دس روپے کا نوٹ نکال کر دیا فرمایا پانچ روپے رکھ لو میں پانچ روپے کا نوٹ واپس کرنے لگا تو حضرت نے فرمایا واپس کیوں لیتے ہو یہ بھی دے دو۔''

(مکتوب بنام مؤلف کتاب حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ)

آپ کا یہ خاص انداز اور طریقہ تھا کہ جن لوگوں نے قادیانیت کے خلاف کام کرنے کے لیے رات کی نیند اور دن کا چین ختم کر رکھا تھا،انہیں خاص طور پر نوازتے اور ان کے ساتھ محبت اور پیار کی انتہا کر دیتے تھے۔ان کی یہ محبت اور یہ پیار رہنما کے دل میں ایک ایسا جذبہ اور جسم میں ایک ایسی طاقت پیدا کر دیتی تھی،جس سے دل ودماغ کی کیفیت ہی بدل جاتی تھی۔مجلس احرار اسلام کے بارے میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ جنونی لوگوں کی جماعت ہے۔یہ جنون وعشق جو انھیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے ہے فقط اللہ تعالیٰ کا کرم اور حضرت رائے پوریؒ کی دعاؤں کا ہی صدقہ ہے کہ آج احرار رضا کار سے لے کر احرار رہنما تک بڑے دھڑلے سے یہ کہہ سکتا ہے:

تشکیلِ نو میں میری ہے میرے جنوں کا ہاتھ
میرا شکوہ ذات ہے میرے ثبات میں

کسی محاذ پر ڈٹ جانا اور ڈٹے رہنا،اسی کو ثبات کہا جاتا ہے اور دیکھا جائے تو یہ ثبات تب پیدا ہوتا ہے جب مؤقف کی صداقت پر لازوال یقین ہو۔مجلس احرار اسلام نے ردّ قادیانیت کا کام شروع کیا تو پھر اُسے ہر حال میں جاری بھی رکھا۔اُس وقت بھی جب سب نے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے اُسے چھوڑ دیا۔دراصل دیکھا جائے تو یہ ثبات ہی تو وہ اعزاز ہے جس پر بجا طور پر اللہ کا شکر اور ناز کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔اور یہی سبب ہے کہ ہم احراری اس اعزازِ ثبات پر اللہ تعالیٰ کا ہر وقت شکر بھی ادا کرتے رہتے ہیں اور ہمیں اس پر ناز بھی ہے کہ ہمارے قدم اس میدان میں آگے ہی بڑھے ہیں،پیچھے نہیں ہٹے:

ہم نے ہی ڈالی رسمِ جنوں ہم نے ہی جنوں اعجاز کیا — ہر ایک قدم تھا کوہِ گراں جب ہم نے سفر آغاز کیا
ہم خوگر ہیں طوفانوں کے ہر پہر بسیرا ہے دنیا — کیا خوب ہے ڈالی ریت ہم نے کیسا یہ پیش انداز کیا
بخشی ہے جنوں کی تابانی ہاں رختِ بدن کو لیلیٰ کے — یوں لَو پہ آتش کی ناچے یوں سوز کو ہم نے ساز کیا

مولانا انوری صاحب لکھتے ہیں:

''آخر عمر میں حضرت اقدس کو ردّ مرزائیت کی طرف بڑی توجہ ہو گئی تھی۔مولوی محمد حیات صاحب (جنھیں قادیانیوں اور یہودیوں کی کتابیں ازبر تھیں) کو بلا کر مباحث سنتے اور مولانا لال حسین اختر کو بلوا بھیجتے تھے۔مولانا ابراہیم سیالکوٹی کی ''شہادت القرآن'' کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔دوبارہ اس کی طباعت کرانے کے متمنی تھے۔آخر کار حضرت اقدس نور اللہ مرقدہٗ کی توجہ مبارک سے اس کی دوبارہ اشاعت ہو گئی اور علمی خزانہ ہاتھ آ گیا۔علماء جو اِدھر سے اُدھر کے مسائل میں الجھے رہتے تھے۔اس سے حضرت کو بڑا صدمہ ہوتا تھا۔ان مباحثوں میں حضرت نہیں پڑتے تھے بلکہ اہم کام ردّ قادیانیت کو دیتے تھے۔'' (مکتوب حضرت مولانا انوری بنام مؤلف حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری،ابوالحسن علی ندوی)

کسی علاقے کے عالم دین سے ملتے تو اُس سے قادیانیوں کی سرگرمیوں کے بارے میں خصوصی طور پر پوچھتے جس کے بعد اُس سے فرماتے کہ آپ ردّ قادیانیت کے سلسلے میں کیا کر رہے ہیں۔اگر جواب نفی میں ملتا تو اُس پر اظہارِ ناراضی فرماتے اور اُسے تلقین فرماتے کہ ردّ قادیانیت کے مسئلہ کو دین کے دوسرے کاموں پر اوّلیت دو اور یہ تساہل

وغفلت جوتم نے اس سلسلے میں اختیار کرلیا ہے، اسے چھوڑ دو۔

تحریک ختم نبوت کے دوران تحریک کو کامیابی سے ہمکنار دیکھنا چاہتے تھے۔اس کے لیے اپنے ہر ملنے والے کو تلقین وترغیب کا سلسلہ آپ نے تحریک کے دوران جاری رکھا۔کئی افراد نے آپ کی تلقین پر تحریک میں گرفتاری پیش کی۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی کو اس بات پر تیار کیا کہ وہ قادیانیت کے بارے میں عربی میں ایک کتاب تحریر کریں۔چنانچہ یہ حضرت کی ہی رات دن کی تلقین وترغیب کا نتیجہ تھا کہ چند ماہ میں مولانا ابوالحسن علی ندوی نے قادیانیت کے موضوع پر ایک اہم کتاب تحریر کردی۔مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری میں آپ کی اس خواہش کا محرک اُس کلوکیم (مذاکرہ اسلامی) کو قرار دیا ہے جو جنوری ۱۹۵۸ء میں لاہور میں پنجاب یونیورسٹی میں ہوا تھا۔جس میں مشرقِ وسطیٰ کے بعض علماء نے قادیانیت کے بارے میں کچھ سوالات اٹھائے اور اس بات کا اظہار کیا کہ قادیانیت کے بارے میں عربی زبان میں ایک کتاب ضروری ہے۔تاکہ عرب ممالک کے علماء اس سے استفادہ کرسکیں۔ چنانچہ صوفی عبدالحمید کی کوٹھی میں صرف چند ماہ کے اندر عربی زبان میں کتاب مکمل کرلی گئی۔جس کے بعد حضرت رائے پوری ہی کی

مولانا ابوالحسن علی ندوی کو اس بات پر تیار کیا کہ وہ قادیانیت کے بارے میں عربی میں ایک کتاب تحریر کریں۔چنانچہ یہ حضرت کی ہی رات دن کی تلقین وترغیب کا نتیجہ تھا کہ چند ماہ میں مولانا ابوالحسن علی ندوی نے قادیانیت کے موضوع پر ایک اہم کتاب تحریر کردی۔مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری میں آپ کی اس خواہش کا محرک اُس کلوکیم (مذاکرہ اسلامی) کو قرار دیا ہے جو جنوری ۱۹۵۸ء میں لاہور میں پنجاب یونیورسٹی میں ہوا تھا۔جس میں مشرقِ وسطیٰ کے بعض علماء نے قادیانیت کے بارے میں کچھ سوالات اٹھائے اور اس بات کا اظہار کیا کہ قادیانیت کے بارے میں عربی زبان میں ایک کتاب ضروری ہے۔تاکہ عرب ممالک کے علماء اس سے استفادہ کرسکیں۔ چنانچہ صوفی عبدالحمید کی کوٹھی میں صرف چند ماہ کے اندر عربی زبان میں کتاب مکمل کرلی گئی۔جس کے بعد حضرت رائے پوری ہی کی خواہش پر اس کا اردو ترجمہ کیا گیا اور ''قادیانیت'' کے نام سے بہت جلد ایک اور کتاب منصۂ شہود پر آ گئی۔مولانا ابوالحسن علی ندوی خود تحریر کرتے ہیں کہ یہ کام مجھ جیسے فرد سے بہت ہی کم عرصہ یعنی چند ماہ میں کیسے مکمل ہوا جبکہ میں مزاجاً قادیانی کتب سے دانستہ ناآشنا تھا۔وہ کہتے ہیں میرے دوست واحباب بھی اس پر حیران تھے کہ ایک ایسے شخص کے قلم سے یہ کتابیں کیسے تیار ہوگئیں جو اس موضوع کے ابجد سے بھی واقف نہیں ہے۔

عربی کتاب ''القادیانی والقادیانیۃ'' شائع ہوکر مصروشام کے علاوہ افریقہ کے اُن ممالک میں تقسیم ہوئی جہاں پر قادیانی کارستانی اپنے عروج پر تھی۔مشرقِ وسطیٰ او رافریقی ممالک میں اس کتاب نے علماء کو قادیانیت سے متعارف کرایا۔بعد میں جس کا اردو ترجمہ ''قادیانیت'' شائع ہوئی جو قادیانیت کے بارے میں ایک مفید کتاب کے طور پر اب تک اہل علم کے زیر مطالعہ چلی آرہی ہے۔

ان تمام حالات کو قلمبند کرنے کا مقصد صرف یہی ہے کہ حضرت رائے پوری رحمتہ اللہ علیہ کی ردّ قادیانیت کے سلسلے میں بے پناہ خدمات سے نئی نسل کو متعارف کرایا جائے تاکہ وہ جان سکے کہ قادیانیت کس فتنۂ عظیم کا نام ہے اور اس کے ردّ اور اس کے تدارک کے لیے جو کچھ اُن سے بن پڑے کرگزریں۔اس کے ساتھ نئی نسل اس بات پر بھی سوچے اور غور کرے کہ حضرت انور شاہ کاشمیریؒ اور حضرت عبدالقادر رائے پوری جیسی عظیم ہستیاں فقط مجلس احرار اسلام پر کیوں فریفتہ تھیں اور انھوں نے مجلس احرار اسلام کی سرپرستی اور معاونت میں ہی کیوں اپنے پورے وسائل کو مجلس احرار اسلام کے لیے وقف کردیا تھا؟ آخر میں انہی عظیم ہستیوں کے حوالے سے ایک شعر پر اپنے اس طویل مضمون کو ختم کرتا ہوں جن کا جذبۂ صادقہ اور اُجلا کردار ردّ قادیانیت کے سلسلے میں نئی نسل کے لیے نشانِ راہ بن چکا ہے:

مجھ کو جنوں و جذب کی سوغات دے گیا
گزرا تھا دل کی بستی سے اک کاروانِ شوق